نظامِ زندگی میں صبر واستقامت کی اہمیت

از: مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذِ حدیث دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

زندگی میں بیشتر ایسے واقعات پیش آتے ہیں، جن میں انسان جذبات سے مغلوب ہوجاتا ہے اور غیظ وغضب سے رگیں پھڑکنے لگتی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ فوری طور پر انتقامی کارروائی کی جائے، جیسا بھی ہوسکے سامنے والے کو اپنی برتری اور طاقت کا ایسا کرشمہ دکھایا جائے کہ دشمن طاقتیں ہمیشہ کے لیے زیر ہوجائیں، ممکن ہے اس سے ذہنی وقلبی سکون ملے اور مختلف خطرات سے نجات بھی؛ مگر اسلام نے جذبات میں آکر کسی فیصلہ کی اجازت نہیں دی ہے، تمام ایسے مواقع پر جہاں انسان عام طور پر بے قابو ہوجاتا ہے، شریعت نے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے، عقل وہوش سے کام کرنے اور واقعات سے الگ ہوکر واقعات کے بارے میں سوچنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے، جس کو قرآن کی اصطلاح میں ''صبر'' کہا جاتا ہے۔

قرآن میں ''صبر'' مختلف معانی میں استعمال کیا گیا ہے، اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی اور بدخواہ لوگوں کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی حاسدین اور دشمنوں کے تکلیف دہ کاموں پر غصہ اور اشتعال کے بجائے تحمل، بردباری اور برداشت سے کام لیا جائے، ارشادِ باری ہے: وَ لَاتَسْتَوِیْ الْحَسَنَةُ ولا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بالَّتِی هِیَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ، كَأَنَّهٗ وَلِیٌّ، حَمِیمٌ، وَ مَا یُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ مَا یُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْم. (سورہ فصلت: ۳۴) اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، اگر کوئی برائی کرے تو اس کا جواب اچھائی سے دو، پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہوجائے گا گویا دوست ہے ناتے والا اور یہ بات ملتی ہے انھیں کو جنھیں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قیمت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ وغضب میں صبر کا اور نادانی وجہالت کے وقت حلم وبردباری کا اور برائی کے

مقابلہ میں عفو و درگزر کا حکم دیا ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔ (تفسیر کبیر: ۱۳/۶۴۰)

معلوم ہوا کہ غصہ اور اشتعال شیطانی اثر ہے، شیطان انسان کو مختلف تدابیر کے ذریعہ ابھارنا چاہتا ہے؛ تاکہ وہ جذبات میں آکر کوئی ایسا کام کر بیٹھے جو اس کے لیے دور رس نقصانات کا باعث بنے؛ اسی لیے قرآن نے ہمیشہ عفو و درگزر کی تعلیم دی ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ معاف کرنے والوں کے لیے آخرت میں بڑا اجر ہے۔ بدخواہ اور حاسدین دنیا میں جتنا چاہیں تمسخر اور مذاق اڑالیں، ایک دن ضرور ان کو اپنے کیے ہوئے پر افسوس کا اظہار کرنا ہوگا، دنیا میں اگر کسی مصلحت کے سبب نجات مل بھی گئی تو قیامت جو عدل وانصاف کا دن ہے، وہاں پر ہر ایک کو اچھے اور بُرے عمل کا بدلہ مل کر رہے گا۔ خدا نے اپنا یہ فیصلہ ان الفاظ میں سنایا ہے: قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَايَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ. (سورہ جاثیہ: ۲۴) ''ایمان والوں سے کہہ دیجیے کہ ان کو جو اللہ کے جزا وسزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کردیا کریں؛ تاکہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے، جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے کے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے'' اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی، اس سے بعض مسلمانوں کو طیش آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور مسلمانوں کو عفو و درگزر کی نصیحت کی گئی۔ (تفسیر کبیر ۱۴/۱۷۳)

اس مفہوم پر مشتمل متعدد آیات قرآن میں نازل کی گئی ہیں، جن میں مختلف پیرایہ سے جذباتیت کے بدلے حقیقت پسندی، غصہ اور اشتعال کے بجائے صبر وتحمل اور انتقامی کارروائی چھوڑ کر بردباری اور قوتِ برداشت کی صفت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ صبر کا راستہ جنت کا راستہ ہے اور کسی ناخوشگوار واقعہ پر کسی بھائی کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھنا شیطانی راستہ ہے اور شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے؛ اس لیے اس سے جہاں تک ہوسکے پرہیز کرنا چاہیے۔ (سورہ فاطر: ۶)

حضرت معاذ بن انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنا غصہ اتارنے اور بدلہ لینے پر قادر ہو اور اس کے باوجود وہ اپنے غصہ کو دبائے اور قابو میں رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن مخلوق کے سامنے بلائیں گے اور اختیار دیں گے کہ وہ جنت کی آہو چشم

حوروں میں سے جس کو چاہے لے لے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ جس پر میں عمر بھر کاربند رہوں، آپؐ نے فرمایا: غصہ کبھی مت کرنا، راوی کہتے ہیں اس شخص نے اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے بار بار یہی سوال لوٹایا، مجھے وصیت کیجیے، آپ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا، غصہ کبھی مت کرنا۔ (صحیح بخاری)

غصہ ایمان وعمل کے لیے انتہائی مہلک ہے، خلافِ مزاج کسی واقعہ پر جب انسان بے قابو ہوجاتا ہے تو تمام شرعی رکاوٹیں اس کے لیے بے اعتبار ہوجاتی ہیں اور وہ غصہ کی حالت میں جو چاہتا ہے کرڈالتا ہے؛ اس لیے آپؐ نے حدیثِ مذکور میں غیظ وغضب سے دور رہنے کی تاکید کی ہے، مشہور عالمِ دین مولانا محمد ادریس میرٹھی اس حدیث کے تحت غصہ کی قباحت اور اس کے تباہ کن اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اچھے سے اچھا سمجھدار انسان بھی شدید غصہ کی حالت میں عقل وخرد سے خارج اور بالکل پاگل ہوجاتا ہے، نہ خدا اور رسول کی تعلیمات کا ہوش رہتا ہے، نہ اخلاق وانسانیت کے تقاضوں کا؛ اسی لیے کہا گیا ہے: أَلْغَضَبُ جُنُوْنُ سَاعَةٍ (غصہ تھوڑی دیر کی دیوانگی کا نام ہے) علماء اخلاق نے لکھا ہے کہ بعض مرتبہ شدتِ غیظ وغضب سے انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے یا مستقل طور پر پاگل ہوجاتا ہے اور یہ تو بالکل عام بات ہے کہ غصہ فرو ہونے کے بعد انسان خود کو اپنے کیے پر ملامت کیا کرتا ہے اور بسا اوقات بڑے بڑے دوررس نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں اور اس غصہ کے بھوت پر قابو پانا صبر وضبط کا ملکہ پیدا کیے بغیر اور برداشت وتحمل کی عادت ڈالے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا غصہ نہ کرنے کی وصیت کا منشا درحقیقت صبر وضبط کی عادت ڈالنے کی وصیت فرمانا ہے'' (شرح ریاض الصالحین: ۱۳۵)

جذبات کو قابو میں رکھنے اور صبر وتحمل کی فضیلت اور ثواب کی کثرت اس بنیاد پر بھی ہے کہ اس میں ایک شخص کو امتحان کی مختلف راہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہیں ملتے ہوئے فائدوں سے محرومی کو گوارا کرنا پڑتا ہے، کبھی خارجی مجبوری کے بغیر خود سے اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند کرلینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی بے عزتی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کہیں زیادہ کو چھوڑ کر کم پر قانع ہونا پڑتا ہے، کہیں قدرت رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں کو روک لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی مقبولیت کو دفن کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے، کہیں شہرت اور استقبال کے راستے کو چھوڑ کر گمنامی کے طریقے کو اختیار کرنا پڑتا ہے، کہیں الفاظ

کا ذخیرہ ہوتے ہوئے اپنی زبان کو بند کرلینا پڑتا ہے، کہیں جانتے بوجھتے دوسرے کا بوجھ اپنے سر پر لے لینا پڑتا ہے، کہیں اپنے آپ کو ایسے کام میں شریک کرنا پڑتا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں، ان تمام مواقع پر نفس کو کچل کر خلافِ نفس کام کرنے پر اپنے آپ کو مجبور کرنا پڑتا ہے، یہی وہ راز ہے جس سے انسان کا سفر ہمیشہ بلندی کی طرف جاری رہتا ہے، وہ کبھی ٹھوکر نہیں کھاتا اور نہ کبھی سخت مایوسی کا شکار ہونا پڑتا ہے؛ لیکن جذبات اور غیظ وغضب سے ہمیشہ انسان کو نقصان پہنچتا ہے، اس میں فائدے کا کوئی پہلو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری قوتوں کے باوجود کبھی انتقامی جذبات سے کام نہیں لیا۔ قریش نے آپ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسمِ اطہر پر نجاستیں ڈالیں، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں ہزار گستاخیاں کیں؛ مگر کوئی ایسی مثال نہیں کہ غیظ وغضب سے بے قابو ہوکر آپؐ نے کوئی کارروائی کی ہو، اگر آپؐ چاہتے تو ایک اشارہ میں ہزاروں خون آشام تلواریں نکل سکتی تھیں جو آپ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کرنے والوں کا کام تمام کرنے کے لیے کافی ہوجاتیں؛ مگر قربان جایئے رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے اس راہ کو اختیار کیا اور نہ مسلمانوں کو اس کی ہدایت دی؛ بلکہ موقع بہ موقع آپؐ صحابۂ کرامؓ کے جذبات کو سکون دینے کی کوشش کرتے اور انھیں صبر وضبط تواضع و بردباری کا سبق سکھاتے رہتے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ جیسے سخت مزاج صحابی پیغمبر کا بھی مزاج اسلام قبول کرنے کے بعد نرم پڑ گیا تھا، وہی عمر جو معمولی باتوں میں تلواریں سونت لیا کرتے تھے، جب اسلام کی دولت سے سرفراز ہوئے اور مزاجِ نبوت سے آشنا ہوئے تو تحمل و بردباری کا حیرتناک جذبہ ان میں پیدا ہوا۔ عین اس وقت جب کہ عام انسانوں کا قابو میں رہنا مشکل ہوتا ہے، حضرت عمر فاروقؓ معافی کا اعلان کردیا کرتے تھے۔ امام نوویؒ نے اپنے منتخب کردہ حدیث کے مجموعہ ''ریاض الصالحین'' میں حضرت عمر فاروقؓ کے صبر وتحمل کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اور عبرتناک بھی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں ایک نظر اس پر ڈال لی جائے:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک عرب قبیلہ کا سردار عیینہ بن حصن مدینہ آیا اور اپنے بھتیجے حُر بن قیس کے پاس ٹھہرا، حر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جن کو فاروق اعظمؓ کے پاس بڑی قربت تھی؛ بلکہ وہ اراکینِ شوریٰ میں سے تھے، راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے مقرب وہم نشیں علماء وحفاظِ قرآن ہی ہوا کرتے تھے خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے، سن رسیدہ ہوں یا نوعمر، بہرحال عیینہ نے اپنے بھتیجے حُر بن قیس سے کہا: برادر زادے! تمہیں امیر المومنین سے خاص قرب

حاصل ہے، تم مجھے ملاقات کی اجازت لے دو؛ چنانچہ حر بن قیس نے ملاقات کی اجازت طلب کی، حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی، جب یہ دونوں فاروقِ اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عیینہ نے کہا: اے خطاب کے بیٹے: وہ شکایت جس کے پیش کرنے کے لیے میں آیا ہوں یہ ہے کہ خدا کی قسم، تم ہم کو زیادہ نہیں دیتے ہو اور ہمارے حق میں عدل وانصاف کا معاملہ بھی نہیں کرتے ہو، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اس دریدہ دہنی اور افترا پردازی پر سخت غصہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ آپ نے قصد کرلیا کہ اسے عبرتناک سزا دی جائے۔ حُر بن قیس فوراً بول پڑے: امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَ أْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْن. ''عفو کو اختیار کرو، بھلی بات کا حکم دو اور جاہلوں سے درگزر کرو'' میرا چچا عیینہ بن حصن یقیناً جاہلوں میں سے ہے اور اسلامی اخلاق وآداب سے نابلد ہے، راوی حدیث حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم جوں ہی حُر بن قیس اس آیت کریمہ کی تلاوت کی، حضرت عمرؓ کا غصہ بالکل سرد پڑ گیا اور انھوں نے آیتِ کریمہ کے حکم سے بال برابر بھی تجاوز نہیں کیا۔ (شرح ریاض الصالحین از مولانا محمد ادریس میرٹھی، صفحہ ۱۳۶-۱۳۷)

کسی شخص کی کامیابی اور بلندی کا راز یہ ہے کہ انتہائی جذباتی مواقع پر انتہائی عقل ودانش سے فیصلہ کرے۔ انفرادی زندگی میں تحمل اور صبر وضبط کی ضرورت تو ہے ہی؛ لیکن اس کی اہمیت اجتماعی جگہوں میں مزید بڑھ جاتی ہے، جہاں مختلف اذہان اور طبیعت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ کسی فیصلہ یا میمورنڈم پر غور کرتے ہوئے تمام ذہنوں کی رعایت نہیں کی جاسکتی۔ اس میں بعض کی موافقت ہوگی تو بعض کی مخالفت بھی، ساتھ رہتے ہوئے بہت سی ناموافق باتیں بھی پیش آتی ہیں، کبھی مزاجوں کا اختلاف دل شکنی کا باعث ہوتا ہے تو کبھی کسی کی تنقید سے خفت اٹھانی پڑتی ہے؛ بلکہ قدم قدم پر ہزار امتحانی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے، اگر تحمل اور صبر وضبط سے کام نہ لیا جائے تو ایک دن بھی اجتماعی جگہوں میں شریک رہنا مشکل ہوگا۔ اس طرح سماجی تنظیموں اور اداروں کا نقصان تو ہوگا ہی؛ مگر خود اس کی زندگی تباہ اور ناکارہ ہوجائے گی، ہزار صلاحیتوں کے باوجود اس کا علم وہنر بے فیض اور ناکام ہوگا؛ اس لیے اپنی شخصیت کو نکھارنے، مسائل سے نجات پانے اور خوش گوار زندگی گزارنے کے لیے ضرورت ہے کہ جذبات کو قابو میں رکھا جائے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اعلان کیا تو مکہ کا سارا ماحول آپؐ کے لیے اجنبی بن گیا، وہی لوگ جن کے بیچ آپؐ کا بچپن اور آپؐ کی جوانی گزری، جو آپؐ کی امانت و صداقت کے بڑے مداح اور عاشق تھے، آپؐ کے مخالف اور جانی دشمن ہوگئے، آپؐ کے رشتہ دار

اور اہل خاندان جن سے آپ کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں، ان کا بھی آپ کو کوئی سہارا نہیں ملا، وہ بھی انجانے اور نا آشنا ثابت ہوئے، تنِ تنہا توحید کا پیغام لیے گھر سے باہر نکلے؛ مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ حالات کا رخ بدل گیا، ناموافق ہوائیں اب موافق ہوگئیں، دشمنوں کے دل پسیج گئے اور پھر وہ رسولِ اکرم ﷺ کے ایسے دیوانے بنے کہ تاریخِ انسانیت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عرب کی اجڈ اور گنوار قوموں کے دل و دماغ میں اسلام اور آپؐ کی بے پناہ محبت اتنی جلدی کیسے رچ بس گئی اور کس طرح ان جانے دشمنوں نے دل و جان سے آپؐ کی امارت و اطاعت کو قبول کرلی، یقیناً اس پر انسانی عقلیں دَنگ رہ جاتی ہیں اور حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے اس تاریخی انقلاب میں جہاں رسولِ اکرم ﷺ کی شیریں زبان، اعلیٰ اخلاق، بہتر لب ولہجہ اور پیہم جدوجہد کا حصہ ہے؛ وہیں آپؐ کا صبر وتحمل، بردباری اور قوتِ برداشت نے بھی بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ بلاشبہ صبر وتحمل کا وصف سراپا نیک، صالح، انتہائی مفید و معنی خیز ہے، اس سے سعادت و بھلائی، سکون واطمینان اور کیف ونشاط کے مواقع ہاتھ تو آتے ہی ہیں، ساتھ ہی صبر واستقامت کی راہ پر چل کر لوگوں کی قیادت وامامت کا درجہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، خدا نے اپنا یہ دستور اور قانون بہت پہلے ہی ان الفاظ میں سنایا ہے: **وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّصُدُّوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (السجدہ: ٢٤)** ''ہم نے ان میں سے بعض کو قائد اور امام بنایا جو ہماری باتوں سے لوگوں کو واقف کراتے تھے، یہ ان کے صبر کا بدلہ ہے۔'' مؤمن کی زندگی کا وہ کون سا لمحہ ہے جس میں اس کو کسی نہ کسی طرح جسمانی اور روحانی اذیت و پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو، تاریخ شاہد ہے کہ جس نے بھی ان تکلیف دہ مواقع میں صبر وتحمل سے کام لیا، اس کے لیے بعد میں راستے ہموار ہوگئے، کامیابی کی منزل قریب ہوگئی اور پھر بعد میں دشمنوں کے دل بھی بدل گئے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دَور کی تمام مصیبتوں کو مسکراتے ہوئے قبول کرلیا، اعلانِ توحید کے بعد بت پرستوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت رسانی کے لیے جو نت نئے طریقے ایجاد کیے تھے، اس کی طویل اور دردناک داستانِ سیرت کی تقریباً تمام کتابوں میں موجود ہے، وہ عام راستہ جس میں ہر کس وناکس کو چلنے کا اختیار تھا، جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو پتھر کی بارش برسائی جاتی، کانٹے بچھائے جاتے، تنگ کیا جاتا، جسمِ اطہر پر نجاستیں ڈالی جاتیں؛ بلکہ حرمِ مکی جہاں عام چرند و پرند کو بھی سکون واطمینان اور تحفظ کا یقین ہوتا ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں سکون سے نماز پڑھنے کا موقع تک نہیں دیا گیا،

ابوجہل کے اشارے سے بدبختوں نے آپؐ کی پشتِ مبارک پر اونٹ کی ناپاک اوجھڑی رکھ دی، یہ مخالفت کے دیوانے انسانی حدوں کو پار کر گئے اور آپؐ کی شرافت کو چیلنج کیا۔ کبھی آپؐ کو بیہودہ گالیاں دیں، کبھی جادوگر اور کبھی پاگل اور کبھی شاعر کہا اور ہزار طرح سے گستاخیوں اور بے ادبی کی وہ راہیں وضع کی گئیں جن سے غریب سے غریب اور کمزور سے کمزور تر انسان غصہ سے کانپ اٹھتا ہے؛ مگر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر وتحمل سے کام لیا اور کبھی آپؐ نے ان باتوں پر برہمی تک ظاہر نہیں فرمائی۔

طائف کا واقعہ کسے یاد نہیں ہے، بڑی تمنا اور آرزوؤں کے ساتھ اہل مکہ سے تنگ آکر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر کیا کہ شاید وہاں کے لوگ کچھ موافقت کریں؛ مگر وہ لوگ چار قدم اور آگے نکلے، صرف گالی اور تمسخر پر اکتفا نہیں کیا گیا؛ بلکہ اوباشوں کے ذریعہ اتنے پتھر برسائے گئے کہ قدمِ مبارک خون سے بھیگ گئے، ضعف وکمزوری سے طبیعت بوجھل ہوگئی۔ آپؐ تھک کر جب بیٹھ جاتے تو زبردستی آپؐ کو اٹھایا جاتا اور پھر پتھروں کی بارش برسائی جاتی۔ اس عظیم حادثہ سے عرش پہ کہرام مچ گیا، عذاب کے فرشتے نازل کیے گئے؛ مگر نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب تھا: اگر ان لوگوں نے ایمان قبول نہیں کیا تو مجھے امید ہے کہ ان کی نسلیں ضرور اسلام سے وابستہ ہوں گی، اس صبر وبرداشت کی کیا دنیا مثال پیش کرسکتی ہے؟

یہیں تک نہیں، دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح مکہ کا تھا۔ دشمن اس دن مکمل آپؐ کے قابو میں تھے کہ اگر آپؐ چاہتے تو ایک ایک اذیت کا بدلہ لے سکتے تھے؛ مگر آپؐ نے یہ کہتے ہوئے سب کو معاف فرمادیا لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاء ''تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو'' (سیرۃ النبی ۲/۳۶۲)

وہ لوگ جو خون کے پیاسے تھے اور جن کے دستِ ستم سے آپؐ نے طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں، وحشی جو آپؐ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کیا اور دل وجگر کے ٹکڑے کیے، ان سے آپؐ نے کوئی باز پرس نہیں کی اور نہ ہی ان سے کوئی انتقام لیا، ہندہ اس کرشمۂ اعجاز سے متاثر ہوکر بے اختیار بول اٹھی: یارسول اللہ! آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ کوئی میری نگاہ میں نہ تھا؛ لیکن آج آپ کے خیمہ سے زیادہ محبوب کوئی دوسرا خیمہ میری نگاہ میں نہیں۔ (صحیح بخاری)

ان کے علاوہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر وتحمل اور قوتِ برداشت کے متفرق حیرت انگیز واقعات کتابوں میں موجود ہیں، جن میں بڑی عبرتیں پوشیدہ ہیں اور مصیبت زدگان کے لیے

تسلی کا سامان بھی؛ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند واقعات اپنی نگاہ میں لے آئیں اور آنکھوں کی راہ سے دل میں اتارنے کی کوشش کریں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب فتحِ مکہ کے بعد جنگِ حنین کا واقعہ پیش آیا اور اللہ تعالیٰ نے وقتی شکست کے بعد شاندار فتح نصیب فرمادی اور بے شمار مالِ غنیمت فاتحین کے ہاتھ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کی تقسیم میں شرعی مصلحت کے تحت بعض لوگوں کو جو فتح مکہ کے وقت ہی مسلمان ہوئے تھے اور ابھی مسلمان ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا تالیفِ قلوب کے طور پر ترجیح دی؛ چنانچہ ایک نومسلم قبیلہ کے سردار اقرع بن حابس کو سو اونٹ دیے، عیینہ بن حصن کو بھی اتنے ہی دیے، ان دونوں کے علاوہ اور بھی سردارانِ قریش کو گراں قدر مالِ غنیمت دیا، پرانے مسلمان انصار و مہاجرین پر ان کو ترجیح دی، تو ایک گستاخ شخص بولا: خدا کی قسم اس مالِ غنیمت کی تقسیم میں انصاف نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی یہ تقسیم اللہ کے لیے کی گئی ہے؛ بلکہ اپنی قوم قریش کو خوش کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راویِ حدیث کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: بہ خدا میں اس گمراہ کن پروپیگنڈے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور دوں گا؛ چنانچہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو اس شخص نے کہا تھا آپؐ کو اس کی اطلاع دی، ناانصافی اور قوم پروری کا الزام سن کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا، پھر قدرے سکون کے بعد ارشاد فرمایا: تو پھر اور کون انصاف کرے گا؛ جب اللہ اور اس کے رسولؐ بھی انصاف نہ کریں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس شخص کو کچھ نہیں ملا؛ اس لیے یہ بکواس کررہا ہے، اس کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہزاروں ہزار رحمتیں نازل فرمائیں، بے شک ان کو ان کی امت کی جانب سے اس سے بھی زیادہ ایذائیں پہنچائی گئی ہیں؛ مگر انھوں نے ہمیشہ صبر و ضبط سے کام لیا اور کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی، اسی طرح ہمیں بھی صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے۔ (شرح ریاض الصالحین: ۴۲۱) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نومسلم قبائل اور ان کے سرداروں کو مالِ غنیمت کی تقسیم میں قدیم ترین مہاجر و انصار غازیوں پر فوقیت اور ترجیح محض اپنی مصلحت اور شرعی حکم تالیفِ قلب (نومسلموں کی دلجوئی) کے تحت دی تھی۔ مال کی تقسیم میں ظلم اور ناانصافی کا الزام یقیناً غلط تھا، آپؐ چاہتے تو گمراہ کن پروپیگنڈہ کرنے والے کو سزا دے سکتے تھے؛ مگر آپؐ نے صبر و ضبط سے کام لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ یاد کرکے اپنے غم و غصہ کو تسکین دی۔

(۲) زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا، میعادِ ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے، تقاضے کو آئے، آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سست ہو کر کہا: ''عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو!'' حضرت عمرؓ وہیں تھے۔ یہ گستاخانہ جملہ سن کر وہ غصہ سے بے تاب ہو گئے، اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا او دشمن خدا! تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: عمر! تم سے کچھ اور امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کردوں، یہ فرما کر حضرت عمرؓ سے ارشاد فرمایا کہ قرض ادا کر کے بیس صاع کھجور کی مقدار زیادہ دے دو۔ (بیہقی وابن حبان)

زید بن سعنہ کی سخت کلامی اور انداز کے صحیح نہ ہونے کے سبب حضرت عمرؓ کو فطری طور پر غصہ آ گیا، وہ تلملا اٹھے؛ اس لیے کہ یہ وہ وقت تھا جہاں کوئی بھی انسان بے قابو ہو جاتا ہے، آپ کا اشارہ ہوتا تو حضرت عمرؓ کی تلوار سے زید بن سعنہ کی گردن تن سے جدا ہو جاتی؛ مگر اس کے نتائج بہتر ثابت نہ ہوتے؛ اس لیے آپؐ نے صبر وتحمل سے کام لیا اور عین انتہائی جذبات کے موقع پر اسلام کا یہ بے مثال دلکش قانون اور طریقہ بتایا: عمر! تم سے کچھ اور امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کردوں، بلاشبہ دنیا کا کوئی بھی مذہب حسنِ معاملگی اور اخلاقِ عظیم کی یہ مثال پیش نہیں کرسکتا۔

(۳) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے، جب اٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے، ایک دن حسبِ معمول مسجد سے نکلے، ایک بدو آیا اور اس نے آپؐ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردنِ مبارک سرخ ہوگئی۔ آپؐ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا کہ میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے اور نہ تیرے باپ کا، آپؐ نے فرمایا: پہلے میری گردن کا بدلہ دو تب غلہ دیا جائے گا، وہ بار بار کہتا تھا کہ خدا کی قسم میں ہرگز بدلہ نہیں دوں گا، آپؐ نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوادیں اور کچھ تعرض نہ فرمایا۔ (ابوداؤد، کتاب الادب)

بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں، تہذیب وتمدن سے نابلد اس بدو نے نہ صرف بدکلامی کی؛ بلکہ اس زور سے چادر کھینچی کہ گردنِ مبارک سرخ ہوگئی۔ اس حرکت پر کسی قائد، رہبر، پیشوا، بادشاہ اور امام نہیں؛ بلکہ ایک عام آدمی کے دل میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اپنے سماج ومعاشرہ کے حالات

نگاہوں میں ہیں، بات بات پر انتقامی کارروائی اور پھر اختلاف کا ماحول گرم ہوجاتا ہے، رسولِ اکرم ﷺ نے ساری قوتوں اور سرکارِ دوعالم ہونے کے باوجود کوئی کارروائی نہیں کی؛ بلکہ بددعا تک کے الفاظ زبان سے نہیں نکلے۔ قربان جاؤں میں آپؐ کے صبر وتحمل پر جس نے آپؐ کو دنیا کا امام بنایا۔

(۴) ۵ھ میں امّ المومنین حضرت عائشہؓ پر منافقین نے تہمت لگائی، یقیناً یہ عفو کے حد سے متجاوز تھا؛ اس لیے کہ ہر انسان کو اپنی ماں، بہن اور بیوی کی عزت پیاری ہوتی ہے، ان کے بارے میں آبروریزی کا کوئی بھی جملہ ہر ایک کے لیے ناقابلِ برداشت ہے، یہ کبر نہیں؛ بلکہ عین غیرت اور ثواب کا کام ہے، شریعت نے ان کی عزت وآبرو کے تحفظ کی بڑی تاکید کی ہے؛ بلکہ اس کے لیے جان دینے کو شہادت کا درجہ دیا گیا ہے، رسولِ اکرم ﷺ نے ایسے نازک موقع پر بھی تحمل اور برداشت سے کام لیا۔ مشہور سیرت نگار علامہ شبلی نعمانیؒ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے بڑھ کر طیش اور غضب کا موقع ''افک'' کا واقعہ تھا، جب کہ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی، حضرت عائشہؓ آپؐ کی محبوب ترین ازواج اور ابوبکرؓ جیسے یارِ غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں، شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا، جنہوں نے دَم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا، دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، محبوب کی تفضیح، یہ باتیں انسانی صبر وتحمل کے پیمانہ میں نہیں سماسکتیں، تاہم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا؟'' (سیرۃ النبی ۲/۶۰۳)

رسولِ اکرم ﷺ کی پوری زندگی صبر وتحمل سے لبریز ہے، کسی موقع پر بھی آپؐ نے نفسانی جذبات کا استعمال نہیں کیا، غیظ وغضب اور وقتی معاملات سے طیش میں آکر کوئی بھی اقدام بلاشبہ ہزار مفاسد پیدا کرتا ہے؛ اس لیے ضرورت ہے کہ تمام شعبہائے حیات میں صبر وتحمل سے کام لیا جائے، آقا اپنے ملازم کے قصور اور لغزشوں کو معاف کرے اور اگر وقتی طور پر کبھی آقا ناراض ہوجائے تو ملازم کو بھی اسے برداشت کرنا چاہیے، باپ اپنے بیٹے کے ساتھ اور بیٹا اپنے باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرے، میاں بیوی میں خلش ایک فطری بات ہے؛ مگر اسے باہمی صبر وتحمل سے دور کرتے ہوئے زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی جائے۔ غرض پرسکون اور کامیاب زندگی کے لیے صبر وتحمل اور قوتِ برداشت بنیادی عنصر ہے۔ ہماری پستی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم وقتی طور پر جذبات کے رَو میں بہہ جاتے ہیں، جس سے دوررس نگاہ متأثر ہوجاتی ہے اور سوچ وتدبر کا مزاج نہیں رہتا۔ موجودہ حالات میں خاص طور پر سیرتِ نبویؐ کے اس پہلو کو اپنانے کی سخت ضرورت ہے۔